

سنو پیس و فائر کھٹا

حسین اختر

محبت کی یہ کہانی میں اس شخص کے نام کرتی ہوں جو خود سراپا محبت ہے، جس کی تعریف کے لئے اور ستائش کے لئے لفظ میرے ہاتھ سے دامن چھڑا کر مجھ سے آنکھ پھولی کا گھیل گھیلے گئے ہیں، لیکن بسا اوقات لفظ ساتھ چھوڑ بھی جائیں جذبات کی ان دھبی مہک بہت کچھ بلکہ سب کچھ ہی کہہ جاتی ہے، یہ خوشبو اسے بھی مہکاتی ہے، اس کے لئے بس اتنا کہوں گی۔

ناولٹ

کرنے جا رہے ہیں۔“ ذنوبیہ نے بال برش کرتے ہوئے آئینے میں نظر آتے امتثال کے عکس کو دیکھ کر کچھ تشویش سے کہا تھا۔

”تمہارا بھی جواب نہیں ہے، ہم غلط کیا کرنے جا رہے ہیں، بس جائیں گے ان کو ایک نظر دیکھیں گے اور واپس آ جائیں گے اس میں غلط کیا ہوگا، ہٹاؤ ذرا۔“

”پھر بھی ایسے جانا صحیح ہوگا۔“ ذنوبیہ نے برش رکھ کر اب لپ اسٹک اٹھالی تھی اور شیڈ چیک کرنے لگی تھی۔

”ہاں سچ ہے، بس تم نکلنے کی کرو، تمہاری تیاری ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔“ امتثال نے ایک بڑی سی چادر میں خود کو چھپاتے ہوئے بے صبری سے کہا تھا۔

”ہاں میری تیاری کیا اہمیت رکھتی ہے تیاری تو تمہیں کرنی چاہیے، ویسے بڑی جلدی ہے انہیں دیکھنے کی اک نظر اور ملنے کی۔“ ذنوبیہ



نے اسے شرارت سے چھیڑا تھا۔
”ہاں ہے تو۔“ امتثال نے اعتراف کر لیا تھا۔

”چلو پھر چلیں، اب تمہارے مہر کو اور کیا آزمانا۔“ زنوبیہ نے بھی چادر اٹھائی تھی اور امتثال کی طرح ہی آنکھوں کے سواپورے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

”زنوبیہ میرا تو سانس ہی بند ہو رہا ہے، مجھے لگتا ہے میرا دم کھٹ جائے گا اور یار میں نے آج تک ایسے نقاب کیا بھی تو نہیں ہے، یہ چادر بار بار پھسل جاتی ہے، یار کہیں وہ ہمیں پہچان ہی نہ لیں۔“

”ہاں جب تم ایسی حرکتیں کرو گی تو پھر تو ضرور پہچان لیے جائیں گے اور تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مرواؤ گی۔“ زنوبیہ نے چلتے چلتے رک کر امتثال کا پھسلتا ہوا نقاب درست کیا تھا اور ساتھ ہی اسے ڈانٹا تھا۔

”ڈاکٹر فواز صاحب ہیں۔“ کلینک کے باہر کھڑے ایک لڑکے سے انہوں نے پوچھا تھا۔ ”نہیں بس آنے والے ہیں۔“ اس نے جواب دیا تھا، وہ دونوں اندر داخل ہو گئی تھیں، ڈاکٹر صاحب کی کرسی خالی پڑی تھی اور وہ مریض ان سے پہلے بھی ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہے تھے، وہ بھی چپ چاپ ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھیں۔

”زنوبیہ نقاب تو ٹھیک ہے نا، میرا چہرہ تو نظر نہیں آ رہا، دیکھو مجھے عجیب سی مینشن ہو رہی ہے۔“ اس کی جیسی ہی آواز ساتھ بیٹھی ہوئی زنوبیہ کی سماعتوں سے بار بار تکرار ہو رہی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے بس اب آرام سے بیٹھو، اب تو جو ہونا تھا ہو چکا، نہ خود مینشن لو اور نہ مجھے مینشن۔“

”ڈاکٹر صاحب آئیے۔“ زنوبیہ کی بات

ابھی ادھوری ہی تھی کہ ان کے سامنے بیٹھی عورت نے اپنی بچی سے کہا تھا اور ان دونوں کی نظریں بے اختیار دروازے کی جانب اٹھی تھیں، ڈاکٹر فواز اپنی کرسی سنبھال چکے تھے، وہ عورت اپنی بچی کو لے کر ان کے پاس جا بیٹھی تھی۔

”میں کیا کہوں گی مجھے کیا بیماری ہے۔“ وہی مینشن جو کچھ دیر پہلے امتثال کو ہو رہی تھی اب زنوبیہ کو ستانے لگی تھی۔

”کچھ بھی کہہ دیتا۔“ امتثال کی اک نظر اٹھی تھی، ڈاکٹر فواز کو دیکھا تھا اور بس اس نظر نے ایسا کمال کیا تھا کہ اسے اپنا دل اپنے ہاتھوں سے لگتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا، اس نے گھبرا کر نظر جھکا لی تھی، کبھی کبھی اک نظر بھی ایسا کمال کرتی ہے کہ مضبوط سے مضبوط شخص بھی متاثر ہو جاتا ہے، سارے مریضیں جا چکے تھے ظاہری بات ہے اب ان کی باری تھی، زنوبیہ کچھ دیر تو سوچتی رہی تھی اور پھر دل کڑا کے اٹھ کر ڈاکٹر فواز کے پاس جا بیٹھی تھی، اب تو جھوٹ بولنے کا سوچ کر اس کی اپنی تانیں بھی کانپنے لگی تھیں۔

”جی!“ ڈاکٹر فواز نے ذرا غور سے اک نظر سامنے بیٹھی امتثال پر ڈالی تھی اور دوسری نظر اپنے قریب بیٹھی زنوبیہ پر ڈال کر پوچھا تھا۔

”وہ..... وہ ڈاکٹر صاحب سر میں درد ہے، چکر آتے ہیں۔“ اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر جلدی سے کہہ دیا تھا۔

”بلڈ پریشر تو نارمل ہے، نیند ٹھیک طرح سے آتی ہے۔“ ڈاکٹر فواز کی بظاہر ایسا کوئی مسئلہ نظر نہیں آیا تھا، اس نے پوچھا تھا اور پھر اپنے اسٹنٹ کو میڈیسن لکھ کر دے دی تھی۔

”سنیے، میڈیسن کس طرح کھانی ہے یہ تو سن لیں۔“ میڈیسن لے کر زنوبیہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں امتثال کو اٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور دونوں کلینک کے دروازے تک آ بیٹھی تھیں جب

انہیں ڈاکٹر صاحب کی آواز سنائی دی تھی، ان دونوں کے قدم دروازے پر ہی زنجیر ہو گئے تھے، آخر بوکھلانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے انہیں خود پر غصہ آ رہا تھا۔

”دو دو کھٹنے بعد۔“ ڈاکٹر فواز نے زیر لب مسکرا کر کہا تھا اور وہ دونوں سنتے ہی باہر نکل گئی تھیں۔

”کون ہو سکتی ہیں؟“ ڈاکٹر فواز ان کے جانے کے بعد گہری سوچ میں ڈوبنے لگے تھے۔ ”مریض تو نہیں تھیں۔“ سوچتے سوچتے اس نے ایک ہی نکتہ نکالا تھا۔

”اب بتاؤ کیسا ہے؟“ گھر پہنچتے ہی زنوبیہ نے اس سے پوچھا تھا۔

”مہر تو گرو، پانی تو پیئے وہ بتا دیتی ہوں۔“ امتثال اب زنوبیہ کو ستانے کے موڈ میں تھی اس لئے اسے گھر سے میں آتے ہی چادر اتار کر پھینکتے ہوئے پوئلٹھا کر گاس میں پانی بھرنے لگی تھی۔ ”یہ پانی دانی بعد میں پی لینا پہلے جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ زنوبیہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بول پھینکی تھی۔

”دیکھو اب زیادہ ہنومت میں پوچھ رہی ہوں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ کتنا بے بس ہے انسان قسمت کے آگے ہر پنا ٹوٹ جاتا ہے حقیقت کے آگے جس نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا دنیا میں وہ بھی جھک جاتا ہے چاہت کے آگے امتثال نے بڑے جذب سے شعر پڑھا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ زنوبیہ نے چیخ کر کہا تھا۔

ابن انشاء کی کتابیں

طنز و مزاح سفر نامے

- اردو کی آخری کتاب
- آوارہ گرد کی ڈائری
- دُنب گول ہے
- ابن بطوطہ کے تقاب میں
- چلتے ہو تو چین کو چلئے
- نگرانی نگرانی پھر مسافر

سُحری جھوٹے

- چاند نگر
- اس بستی کے اک کو چے ہیں
- دلِ وحش

طنز و مزاح

- باتیں، انشاء جی کی
- دغل در معقولات
- اک سے کیا پردہ
- بقلم خود

لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکھر روڈ لاہور

”یہی مائی ڈیر کہ ڈاکٹر فواز بہت اچھے ہیں، جو بھی قسمت میں ہوا بہت اچھا ہوا، اس بندے کی ایک نظر نے یہ کمال اور یہ چال کر دیا ہے آگے جانے کیا کیا گل مچلتے ہیں۔“

”اوہ جھٹک گاڈ، ویسے ایک بات بتاؤں مجھے بھی اچھے لگے ہیں، چلو یہ تو مانا کہ تم نے ان کو اوکے کر دیا لیکن یہ پہلی نظر کا کمال، یہ شعر، یہ چہرے پر مچلتے رنگ ان کی کیا کہانی ہے۔“ وہ اب انتظار کے اندر تک اترنا چاہتی تھی۔

”کہانی تو کوئی نہیں، بس دل پہ جو گزری جھپٹیں بتاؤ۔“

”اس کا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب سے قسمت کے ستارے مل گئے ہیں۔“

”قسمت کے ستاروں کا تو پتہ نہیں ہاں دل کے ستارے ضرور مل گئے ہیں۔“ انتظار نے دل میں محض سوچا تھا زونبیا کو کہہ نہ سکی تھی، اگر کہہ دیتی تو وہ چیخ چھیخ کر اس کا جینا محال کر دیتی۔

انتظار عالم اور زونبیا حق دونوں بہترین دوست تھیں، خلوص، محبت، چاہت، ولداری دکھوں سکھوں کی سانچہ اور پیار یہ سب چیزیں ان کی بہہ دوئی تھیں یہی چیزیں فی زمانہ تاپیر تھیں اور انہوں نے ہی ان دونوں کو ایک ان دوسری زنجیر میں باندھ رکھا تھا، دونوں نے اکٹھے ہی گرے پڑے کیونکہ اب مستقبل کے خواب بننے نہ سکتے تھے، انتظار عالم ہنس کر کہتا جاتا تھا جب اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تو زونبیا کیسے پیچھے رہتی اسے بھی تو انتظار عالم کی تقلید کرنا تھی، انہی دنوں جب دن اور رات بے فکری کے ہندو لے میں سفر کرتے گزر رہے تھے انتظار عالم کے گھر کسی کے توسط سے ڈاکٹر فواز کا رشتہ آیا، ڈاکٹر فواز اس کے بابا کے جاننے والوں میں سے کسی کا رشتہ دار تھا اور جاننے والوں کے جاننے والوں نے ان کی اتنی تعریفیں کیوں کی تھیں کہ وہ تو بس

اس رشتے پر جی جان سے فریفتہ ہو گئے تھے۔

”مگر زونبیا میرا آئیڈیل۔“ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے والدین فواز کو ہاں کر کے ہی دم نہیں لگے اس نے زونبیا کے سامنے دل کی بے چینی بھول کر رکھ دی تھی۔

”یار یہ آئیڈیل وائیڈیل کچھ نہیں ہوتا۔“

زونبیا نے لاپرواہی سے اس کی بات چٹکیوں میں اڑا دی تھی۔

”پھر بھی وہ ڈاکٹر صاحب تو قدرے خشک مزاج سے بندے ہوں گے اور میں ٹھہری لطیف جذبات و احساسات رکھنے والی لڑکی جسے سوائے بارش کی ہنسی اور پھولوں کی مہک کے اور کچھ سوچنا نہیں، وہ ان چیزوں کو کہاں مانتے ہوں گے، پھر ان کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی۔“ اس کا دل مطمئن ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ خشک مزاج ہوں گے۔“ زونبیا نے اسے ٹھکراتا تھا۔

”فرض کر لینے میں کوئی ہرج نہیں اگر فرض کرو ایسے ہوئے تو۔۔۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”بی بی شادی تو تمہیں کہیں نہ کہیں بہر حال کرنی ہے ڈاکٹر فواز نہ ہوئے کوئی اور ہوا اور وہ بھی ٹھہرا خشک مزاج تو پھر کیا کرو گی۔“

”لیکن یہ بھی تو نہیں پتہ وہ دیکھنے میں کیسے ہوں گے۔“ اب ایک تشویش ختم ہوئی تھی تو دوسری پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

”ہاں اس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“

”کیا؟“ وہ کھسک کر زونبیا کے کچھ اور قریب ہوئی تھی۔

”یہی کہ ان کو ایک نظر دیکھ لیا جائے، آخر اسی شہر میں ہیں نا وہ، تم ایک نظر دیکھ لو پھر انگلی آگئی کو اپنی مرضی کرنے دو۔“ زونبیا نے اس کی پریشانی کا بڑا موثر حل نکالا تھا۔

”ہاں یہ صحیح ہے۔“ زونبیا کی بات سن کر وہ پر جوش ہی ہو گئی تھی۔

”لیکن پہلے یہ سوچو کہ ان کو کیسے اور کہاں دیکھا جائے، پھر بعد میں خوش ہو لینا۔“

”یار بابا بتا رہے تھے وہ شام میں کلینک پر جاتے ہیں اگر ہم مریم بن کر چلے جائیں تو ان کو کیا پتہ چلے گا۔“

”ہوں، آئیڈیا تو زبردست ہے، لیکن خیال رہے کسی کو پتہ نہ چلے ورنہ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مروادو گی۔“

”نہیں پتہ چلے گا تم یہ بتاؤ کس دن چلیں۔“

”کل ہی چلے چلتے ہیں۔“ زونبیا نے کہا تھا اور وہ مل کر منصوبہ بنانے لگی تھیں۔

”ای جان آپ۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، ماں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر سیدی ہو بیٹھی تھی۔

”کیا کر رہی ہو۔“ وہ اس کے بیڈ پر آ بیٹھی تھیں۔

”کچھ نہیں، یہ کتاب پڑھ رہی تھی، کوئی کام ہے کیا۔“

”نہیں کام تو کوئی نہیں ہے، بس تم سے کچھ بات کرنا تھی تمہیں پتہ تو چل گیا ہو گا کہ آج کل تمہارے لئے ڈاکٹر فواز کا رشتہ آیا ہوا ہے، تمہارے بابا نے یہ تصویر دی ہے، پتا تم ایک نظر دیکھ لو اور پھر ہمیں بتا دینا، ہم آج کل میں اس رشتے کو فائل کرنا چاہ رہے ہیں۔“ انہوں نے کانڈ میں لپٹی ہوئی ایک تصویر بیڈ پر رکھ دی تھی۔

”ای جان یہ تصویر جیسی تھی ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، آپ نے اور بابا نے میرے لئے جو بھی کیا ہو گا، تمنا صحیح کیا ہو گا، آپ اپنی مرضی سے جو بھی فیصلہ کریں مجھے منظور ہے۔“ اس نے تصویر دیکھ بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دیا

تھا۔

”میری بچی جیتی رہو۔“ اس کی امی جان نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی تھی اور خوشی سے ایسی سعادت مند اولاد اسے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں سے نوازتے ہوئے باہر چلی گئی تھیں۔

”ای جان آپ کو کیا پتہ جس کو جا کر خود دیکھ لیا ہو اس کو تصویر میں دیکھ کر کیا کرنا۔“ امی کے جانے کے بعد اس نے آنکھیں موند لی تھیں، دو مسکراتی آنکھیں چہم سے تصور میں یوں آن سہائی تھیں کہ دل کی دھڑکن میں اپکل سی جگہ گئی تھی۔

تجے روز دیکھوں قریب سے میرے شوق بھی ہیں عجیب سے مجھے مانگنا ہے تجھ کو اب بس اپنے رب اور اس کے حبیب سے میری آنکھ میں بھی ہے عاجزی میرے خواب بھی ہیں غریب سے میرے سب دکھوں کی دوا ہو تم ملے گا سکون کیا لمبیب سے میں بہت خوش ہوں یوں جوڑ کر نصیب اپنا تیرے نصیب سے ڈاکٹر فواز کے نام کی انگوٹھی جلد ہی اس کے ہاتھ میں سج گئی تھی، سب لوگ بہت خوش تھے اور اس کے دل کی عجب کیفیت تھی، ایسی کیفیت جس کی سمجھ کم از کم اسے بھی نہ آئی تھی۔

”کیسا لگ رہا ہے۔“ ایک دن زونبیا نے اس کا گھبراؤ کر لیا تھا۔

”کیا؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی۔

”وہی ڈاکٹر صاحب سے رشتہ جوڑ کر۔“

”بہت اچھا۔“

”صرف بہت اچھا۔“ زونبیا بے یقینی سے بولی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“ امتثال نے اسے گھورا تھا۔

”کہنا نہیں پوچھنا چاہتی ہوں، وہی جو تم چھپا رہی ہو۔“ زنبیہ اپروائی سے نمکو والی پلیٹ گود میں رکھے نمکو کھاتی رہی جیسے اس وقت اس سے زیادہ ضروری کام کوئی اور نہیں تھا۔

”میں کیا چھپاؤں گی۔“

”کچھ تو چھپا رہی ہو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تم سے کچھ بھی چھپانے کی اور پھر اگر ڈاکٹر فواز مجھے اچھے لگے ہیں تو اس میں چھپانے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ امتثال جانتی تھی اگر زنبیہ کو ایک ہی دفعہ سچ بتا دے گی تو روز روز ہونے والی بحث سے جان چھوٹ جائے گی۔

”میں بھی کہوں آخر بدلے بدلے میرے سر کا نظر آتے ہیں۔“ زنبیہ اسے چیخڑنے سے باز نہ آسکی تھی۔

”مرہم۔“ امتثال نے پاس پڑا اکیہ اٹھا کر اس کو دیے مارا تھا، زنبیہ کی ہنسی کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

”ہیلو! ڈاکٹر فواز بات کر رہا ہوں۔“

وہ اک عام سی شام تھی، سائے دیواروں کو پوری طرح ڈھانپ چکے تھے، پھولوں نے اپنے سر جھکا لئے تھے اور چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس لوٹنے لگے تھے، جب امتثال نے ایک اجنبی نمبر سے اپنے سیل پر ایک کال ریسیو کی تھی، لیکن کال کرنے والے کے تعارف کروانے کی دیر تھی اس کی ساری حیات ایک دم سے بیدار ہوئی تھیں اور دل گویا سماعتوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

”ہیلو!“ وہ ہوش و حواس میں کہاں رہی تھی۔

”بول سکتی، ڈاکٹر فواز نے جیسے اسے خواب سے

جگایا تھا۔

”جی!“ اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

”امتیال عالم بول رہی ہیں۔“ انہوں نے تصدیق کی تھی۔

”جی! امتثال۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ بات حال چال سے شروع ہوئی تھی اور جب فون بند ہوا تب تک ایک دوسرے کی پسند ناپسند سے لے کر وہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔

نوشی گیلائی کہتی ہیں، خواہش سے لبریز موسم خوش خیال میں سرخروئی کا نشہ جب وارد ہوتا ہے تو لگنے لگتا ہے کہ جیسے عشق نے پتھر سے نمی مانگ لی، انا کے دریا کا بند ٹوٹ گیا اور محبت کی وادی کے تمام دکھ بہا۔ گیا، فلک بوس غرور زمین بوس ہو گیا، پہاڑ سے آبشار پھوٹ پڑی، شبنم نے الود کو تھڑکھڑکایا، ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تاریک راتوں کو منور کر گیا، خوشبو کا جھونکا محسوس جسموں اور دماغوں کو معطر کر گیا، چمچی فنس میں پھڑپھڑا کر برسکون ہو گیا، ایک کلی مسکرانے کی ابدی جزا پائی، ایک زخم شفیق پوروں کی جراحت سے شفا یاب ہو گیا شاید یہ عالم جنوں تھا یا لمحہ ادراک۔

ایسا ہی لمحہ ادراک امتثال عالم کے دل کی کلی بے کھلا گیا تھا، وہ دل جو کم ہی کسی پر کھلتا تھا جسے کوئی اس معیار کا لگتا ہی نہ تھا کہ وہ اس کا مکین بن سکتا اور اب ڈاکٹر فواز اس دل کے ہر بند کو اڑ کو کھول کر بڑی تمکنت سے مکین ہو گئے تھے۔

”وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ کچھ دنوں بعد وہ ایک بار پھر اداس صورت لئے زنبیہ کے سامنے بیٹھی تھی۔

”وہ کون؟“ زنبیہ کو بھی اسے چھیڑنے میں

جانے کون سا مزہ ملتا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب!“

”تو مل لو اس میں مشکل کیا ہے۔“

”ہونہ، کتنے آرام سے کہہ دیا ہے مل لو، شکل کیا ہے، تمہیں پتہ ہے یہ مشکل نہیں ناممکن کام ہے، بابا کو پتہ چل گیا تو وہ اگلے جہان پہنچا کر ہی چھوڑیں گے۔“ امتثال نے زنبیہ کے ٹھنڈے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

”تو پتھر رہنے دو۔“ زنبیہ کے سکون میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

”رہنے کیسے دوں، ان کا اصرار تو بڑھتا جا رہا ہے اور خواہش بھی، میں ان کی خواہش کو کیسے رد کر دوں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بڑا خیال ہے ان کا۔“ زنبیہ ہنسی تھی۔

”تم مجھے جب ایسے چھیڑتی ہو تو پوری مسخرہ گنتی ہو، اس لئے یہ مسخرہ پن چھوڑو اور بتاؤ کہ کب اور کہاں ملیں۔“

”کیا مطلب بھی، کہاں ملیں، بس تم ملو گی اپنے ساتھ مجھے کیوں شامل کر رہی ہو۔“

”تمہیں یاد میں آئیگی کیسے جاسکتی ہوں تمہیں میرے ساتھ جانا ہو گا۔“

”میں تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی، ماننا تمہیں ہے مجھے نہیں۔“

”اوہو جانتی ہوں مجھے ہی ملنا ہے لیکن تم ساتھ نہیں ہو گی تو میں کیسے جا پاؤں گی، تم اکیلی بھی تو جاسکتی ہو۔“

”تمہیں میں اکیلی نہیں جاسکتی ہوں، اگر جا سکتی تو تمہاری مٹیس کیوں کرتی۔“ امتثال نے منہ بنا کر کہا تھا۔

”ہاں وہ تو مجھے پتہ ہی ہے آج کل اپنے مطلب کی وجہ سے ہی تم مجھے اتنا برداشت کر رہی ہو۔ رنہ ستر۔ امتثال عالم اور خود غرضی کا مظاہرہ نہ

کریں یہ کس کتاب میں لکھتا ہے۔“

”چلو یونہی سہی، پھر کب جائیں۔“ امتثال اس کی سب باتوں کو نظر انداز کر کے پھر سے اپنے مطلب کی بات پر آگئی تھی۔

”لو کی اتم تو بھلی پر سر سو جا رہی ہو، کچھ دم تو لو، کچھ تو سوچنے کا موقع دو۔“ زنبیہ نے کہا تھا۔

”دادی اماں سوچ لیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں تب تک آپ اچھی طرح سوچ لیں۔“

امتیال اسے کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی، زنبیہ اس کو جانا دیکھ کر گھور کر رہ گئی تھی، کیونکہ جانتی تھی وہ ارادوں کی لکنتی پکی ہے جو دل میں ٹھان لے۔ وہ کر کے ہی چھوڑتی ہے۔

وہ ایک روشن دن کے اختتام پر ڈھلنے والی سرمئی مگر دلکش سی شام تھی، امتثال اور سفید کے درختوں میں سائے گہرے ہو رہے تھے، امتثال کے پودوں سے لٹکتے زرد پھولوں کی عجیب سی باس ابھی تک فضا میں پھیلی ہوئی تھی، اچانک شام کی ٹھنڈی سی ہوا جلنے لگی تھی۔

ہوا اور پھولوں کا بھی عجیب رشتہ ہے، ہوا شرارت پر آمادہ ہو جائے تو ان کو جتی جتی کر کے بکھیرتی چلی جاتی ہے اور پھول کیا کرتے ہیں اس بکھیرنے والی ہوا کو خوشبو سے اتنا بو بھل کر دیتے ہیں کہ وہ جہاں جہاں سے گزرتی ہے جس ٹکڑے میں جاتی ہے ہر جگہ ہر کسی پر یہ خوشبو بچھا کر کرتی چلی جاتی ہے، وہ دونوں امتثال اور سفید کے درختوں کے جھنڈ میں سے گزر کر اس جگہ جا بیٹھی تھیں جہاں ڈاکٹر فواز کو ان سے آکر ملنا تھا۔

وقت لمحہ لمحہ آگے بڑھ رہا تھا، گھڑی کی ٹیک ٹیک دل کی ہر دھڑکن کا ارتعاش بڑھ رہی تھی، خوشبو نہیں ہوا کو بو بھل سے بو بھل بنا رہی تھیں۔

”ایسے میں انتظار کی کیفیت، وہ بھی جان

لیوا انتظار کا رنگ طبیعت میں کس قدر اضطراب اور بے چینی پیدا کرتا ہے، یہ ہی جان سکتا ہے جو اس رنگ میں جھجک کر بیٹھا ہو۔

”السلام وعلیکم!“ سہلے ان کے پاس ایک مسکور کن سی خوشبو آکر ٹھہری تھی اور پھر ڈاکٹر فواز کی آواز امرت بن کر ساعتوں میں چلی گئی تھی۔

”علیکم السلام!“ وہ نوں نے زیر لب کہا تھا، وہ ان کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آپ لوگ باتیں کریں احتیال میں ذرا وہ چینٹنگز دیکھ کر آتی ہوں۔“ زونو یہ کو اپنا آپ وہاں عجب سا لگا تھا اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کر کے احتیال کو مخاطب کیا تھا اور اٹھ کر چلی گئی تھی۔

کبھی وقت ملے تو آ جاؤ ہم جھیل کنارے جا بیٹھے تم اپنے مسکھ کی بات کرو۔

ہم اپنے دکھ کی بات کریں اور ان ٹھوں کی بات کریں جو سنگ تمہارے بیت گئے اور عید خزاں کی نظر ہوئے

ان سبز رتوں کے دامن میں ہم پیار کی خوشبو مہکا میں ان پتھر سے سبز نظاروں کو ہم آنکھوں میں تصویر کریں

اپنے پیار کے چادو سے ہم ٹھوں کو جاگیر کریں

”کیسی ہیں آپ؟“ زونو یہ کے جانے کے بعد ڈاکٹر فواز نے خاموشی کا نقاب اتارا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ تین لفظوں کے بعد پھر لمبی چپ تھی۔

”کچھ تو کہیے نا، کیسا لگ رہا ہے آج یہاں میرے ساتھ۔“

چاہ رہا تھا کہ کہہ دے کہ یہ لمحات ساری عمر بھاری ہو گئے ہیں، ان لمحات کا کوئی مول نہیں ہے، جو شخص کل تک نہ ہاتھ کی کپڑوں میں تھا نہ دل کے ایوانوں میں، آج اگر قسمت کا ستارہ بن کر مقدر کے آچل پر چمک رہا ہے اور دل تو اب اپنے پاس رہا ہی نہیں، وہ تو کب کا ان کا دسترس میں چلا گیا، اس شخص کے ساتھ گزارے گئے چند لمحات چند باغیچہ گزریاں کس قدر افسوس ہیں وہ ان کا اندازہ کیونکر کر پاتا۔

”جیسے بھی بہت اچھا لگ رہا ہے بلکہ دل چاہ رہا ہے وقت یہیں رک جائے، لیکن پھر سوچا ہوں یہ وقت ہو یا آنے والے سب لمحے اپنے ہی تو ہیں، آپ آج بھی میرے ساتھ ہو آپ کو نظر بھی میرے ساتھ ہوتا ہے۔“

”اب چلیں۔“ زیادہ دیر تک ڈاکٹر فواز کے سامنے ٹھہرنا اس کے بس کی بات کہاں تھی۔

”کہاں ابھی تو آئے ہیں۔“ وہ ہنس بولے تھے۔

”نہیں پھر دیر ہو جائیگی، اب چلتے ہیں۔“ وہ تو بس پر شوق نظروں سے جان چھڑانا چاہ رہا تھی۔

”اوکے۔“ ڈاکٹر صاحب بھی تاجا چاہے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں جا رہی تھی اب نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر سانس لینا بھی مشکل لگنے لگا تھا، یہ محسوس نہیں جاتی بس خود رو پودے کی طرح ہو جا ہے، خود بخود اب شب و روز کا ایسا کون سا بل جب وہ لمحہ بہ لمحہ ایک دوسرے کے حال احوا سے باخبر نہیں رہتے تھے اور اتنی زیادہ وابستگی اس قدر جاہت خوشبو بن کر جہاں جہاں پھیل گئی، پھیلی چلی گئی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب دن تو گزرتے ہی نہیں ہیں، لمحات کو کسی نے زنجیر کر دیا ہے اور گھڑیاں ٹھہر گئی ہیں۔“ وہ اب ڈاکٹر فواز سے بر ملا کہہ دیتی تھی۔

”ادھر بھی یہی حال ہے ڈیرا لہن کیا کریں، جو انتظار ہمیں سونپا گیا ہے ہمیں اس کو کسی نہ کسی طور تو گزارنا ہی ہے، صد شکر کہ کو ابھی فون پر ہی سہی کوئی رابطہ تو ہے وہ کہتے تھے۔“

”ہاں اور اگر رابطے کی یہ سہیل بھی نہ ہوتی۔“

”تو پھر دن زیادہ آرام و سکون سے گزرتے۔“ ڈاکٹر فواز ایک نیا کتہ نکالتے۔

”وہ کیسے؟“

”بھی دیکھو اب بات ہوتی ہے تو ملنے کی تڑپ بڑھتی ہے، ایک دوسرے کو دیکھنے کو دل کرتا ہے، ورنہ تو آرام سے بیٹھے رہتے، کہ چلو رشتہ ملے ہوا ہے تو اک نہ اک روز شادی بھی ہو جائے گی۔“

”ہوں یہ تو ہے۔“ وہ نورمان جاتی تھی، ڈاکٹر فواز کی کسی بات کو جھٹلانا یا اس سے انکار کرنا اب احتیال عالم کے لئے ممکن ہی کہاں رہا تھا۔

”احتیال کل شاید ہماری بات نہ ہو سکے۔“

”تو توقف کے بعد ڈاکٹر فواز کو کچھ یاد آیا تھا۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اچانک ملی مجھے کسی کام سے شہر سے باہر جانا ہے۔“

جانیں گے۔“

”تم یہ سوچنا ہی مت، بس یہی سمجھنا کہ میں اسی شہر میں ہوں۔“ حقیقت میں فواز کو اتنی محبت دیکھ کر خوشی اور فخر کا ملا جلا احساس ہوا تھا۔

”کیسے نہ سوچوں میں سانس لوں گی تو اس شہر کی فضاؤں میں آپ کی مہک شامل ہی نہ ہو گی۔“ وہ ابھی سے اداس ہونے لگی تھی۔

”فواز آپ کب واپس آئیں گے۔“ اگلے دن وہ ابھی منزل پر پہنچا نہیں تھا کہ احتیال کا فون آ گیا تھا۔

”مار ابھی تو راستے میں ہوں۔“ فواز نے زیر لب مسکرا کر کہا تھا۔

”اچھا۔“ اس نے مایوس سا ہو کر فون بند کر دیا تھا۔

سارا دن گزر گیا تھا، شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے، رات چار سو اپنے پر پھیلانے لگی تھی جب احتیال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور اس نے غم لہجے میں کہا تھا۔

”رات کو ٹھہرنے کا پروگرام تھا، لیکن اب نہیں رکوں گا، بس ابھی واپس آ رہا ہوں۔“ دوری کا سہنا فواز کے لئے بھی مشکل ہو رہا تھا، اس نے تسلی اور واپس آنے کا عندیہ دینوں دے کر احتیال کی کچھ پریشانی کم کر دی تھی، اس کے واپس آنے کا سن کر ہی وہ مطمئن و سرشار سی ہو گئی تھی۔

”یہ کیا پاگل پن تھا۔“

”وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔“

”لیکن میں بھی کیا کریں، اس میں کیا قصور۔“

”نہیں یہ ہے تو پاگل پن۔“ پریشانی کچھ کم ہوئی تو اسے شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا تھا، میں تو ہر کام سے اور ہر کسی سے جان چھڑا کر یوں بھاگا کہ گھر میں آ کر

ہی دم لیا، تم نے تو مجھے بہت پریشان کر دیا تھا۔“ گھر آتے ہی فواز نے سب سے پہلے اس سے رابطہ کیا تھا۔

”تو میں کیا کرتی، آپ نہیں تھے تو دل کسی طور ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔
”ایسے تو میں کہیں جا ہی نہیں پایا کروں گا۔“ جھنجھلاہٹ اور پریشانی ختم ہو گئی تھی اور ایسی محبت پر فواز نے مغرور سا ہو کر امتثال سے پوچھا تھا۔

”تو آپ کو جانے دے گا بھی کون۔“ اس کی ہنسی جھرنوں کی طرح پھوٹ پڑی تھی۔
”جناب اب ہم جانا بھی نہیں چاہتے۔“ یونہی باتوں ہی باتوں میں ایک اور خوبصورت شام کا اختتام ہو گیا تھا۔

اس سوچ میں ہوں آج کہ تم کون ہو کیا ہو اک خواب ہو خوشبو ہو میرے دل کی صدا ہو میں اس کے علاوہ تمہیں کچھ کہہ نہیں سکتی تم میری مناجات ہو تم میری دعا ہو بالآخر انتظار تمام ہوا تھا، ہمارے پھول کھلتے چلے گئے تھے، جدائی کی کٹھن گھڑیاں وصل کے لمحات میں ڈھل گئی تھیں اور اب دن عید تھے تو راتیں شب برات۔

”میں نے کہا تھا نا یہ دن جلدی گزر جائیں گے۔“ ڈاکٹر فواز کے چہرے اور لہجے سے خوشی کی کرنیں پھولی پڑ رہی تھیں۔

”ہاں! وقت کیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے۔“ ڈاکٹر فواز کے لہجے سے نکلنے والی خوشی کو امتثال اپنے دل میں محسوس کر سکتی تھی۔

پھر وقت کے سرسبز و شاداب درخت سے دن سوکھے چوں کی مانند ایک ایک کر کے جھڑتے چلے گئے اور محبت کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے وہ دونوں آگے سے آگے بڑھتے رہے۔

”امتنال میں اس برس جانے والے ڈاکٹر فواز کے ساتھ بیرون ملک جانا چاہتا ہوں، کچھ اور کرنا چاہتا ہوں، یہاں سے کیا، کچھ بھی تو نہیں، یہاں میری صلاحیتوں کو رنگ لگ رہا ہے اور یہ ملک پھر بھی ہمیں کچھ نہیں دے رہا۔“ ایک دن ڈاکٹر فواز نے امتثال سے آتے ہی ایک نیا شوٹ کھڑا کر دیا تھا، گو کہ یہ خواہش عرصے سے ان کے دل میں پل رہی تھی لیکن وہ بھی کسی موقع کی تلاش میں تھے جب وہ اس سے بات کر سکتے اور آج وہ موقع آ گیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں فواز، یہاں سب کچھ ہے، اپنا وطن، اپنی مٹی، اپنے لوگ، کچھ تو اپنا ہے، تھوڑا کمزور ہے ہیں یا زیادہ ہے تو خوشی ہے کہ ہمارا خون پسینہ ہماری محبت خاکس ہمارے اپنوں کے لئے اور اپنے وطن کے لئے ہے۔“ وہ تو سن کر بھڑک اٹھی تھی۔

”اس کے علاوہ بھی یہاں بہت کچھ ہے وہ شاید تم بھول رہی ہو، دہشت گردی، ہر وقت بم دھماکوں کا خوف، ڈاکے، چوری، راہزنی، نہ دن، چیم نہ رات کو آرام جہاں جان کے لالے پڑے ہوں جہاں صبح شام لوگ جان بھری پر لے پھرتے ہوں وہاں رہنے کی بات کرنی ہو۔“

”اگر سب لوگ آپ کی طرح سوچنے لگ جائیں تو پھر سب لوگ باہر چلے جائیں، یہ ملک خالی ہو جائے، یہاں ایک فرد بھی رہے کو نہ بچے آپ پلیز اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“ وہ فواز سے لڑنے کے حق میں تھی اس لئے اس نے بات کا طول دینے سے پہلے ہی سمیٹ لیا تھا۔

”یہ خیال میں دل سے نہیں نکال سکتا، مجھے کال کر لیا گیا ہے، اب کے جانے والے ڈاکٹر دند کے ساتھ میں ضرور جاؤں گا۔“
”چلیں اب ملک کو بھی چھوڑیں، ا

سرزمین اپنے لوگوں کا خیال بھی دل سے نکال دیں، آپ نے کیا میرے بارے میں سوچا ہے میں کیسے رہ پاؤں گی آپ کے بغیر، آپ اتنے خود غرض کیسے ہو گئے ہیں۔“
”تمہارا نہیں سوچوں گا تو کس کا سوچوں گا، دیکھو امتثال تم بھی مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، یار بس تھوڑے دنوں کی بات ہے، بہت تھوڑے سے دنوں کی جدائی برداشت کرنا ہوگی میں تمہیں بہت جلد وہاں اپنے پاس بلواؤں گا۔“ اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر فواز کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

”میں ایک دن بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی اور آپ دنوں کی بات کرتے ہیں جاتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے میری زندگی ختم کر جائیے گا، پل پل مرنے کے لئے میں نہیں رہ سکتی۔“ فواز سے دور رہنا سوہان روح ہی تھا، آنسو قطار در قطار پلکوں کی باڑھ توڑ کر چہرے کو بھگونے لگے تھے۔

”افوہ، ایک تو تم بہت جلدی جذباتی ہو جاتی ہو، اپنا ہی سوچتی ہو مگر میرے بارے میں بھی سوچ لیا کرو، میں خود تم سے جدا ہو کر خوش رہ سکوں گا کیا، جدائی کے دن گزارنا جتنا تمہارے لئے مشکل ہوگا اتنا ہی میرے لئے بھی، لیکن اگر آج ہم یہ سب مشکلات صبر سے برداشت کر لیتے ہیں تو کل کو شاندار مستقبل بھی تو ہمارا ہی ہوگا نا۔“ فواز نے اب کے بار سوچ لیا تھا کہ اس بار جا کر ہی رہنا ہے جو مرضی ہوتا ہے اس نے امتثال کو کچھ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”جو آپ کو اور مجھے جدا کر دے ہمیں ویسا شاندار مستقبل نہیں چاہیے۔“ وہ منہ پھلا کر وہاں سے اٹھ گئی تھی، فواز کو سب سے مشکل ترین مرحلہ امتثال کو مٹانا ہی لگ رہا تھا، سب کام آسان ہو جاتے لیکن اگر یہاں جانے میں کوئی چیز رکاوٹ بنتی تو وہ امتثال ہی تھی۔

”اب بس بھی کرو، میں اتنی دور جا رہا ہوں، مجھے خوشی خوشی رخصت کرو، اس قدر برسات میں میں کیسے جا پاؤں گا۔“ آج دو پہر تک فواز کو طے جانا تھا، بالی ڈاکٹر فواز کے ساتھ اس کا انتخاب ہو گیا تھا اس بار اس نے کسی بھی چیز کو پاؤں کی زنجیر نہیں بنے دیا تھا امتثال کا ہر حربہ ناکام گیا تھا اور فواز نے جانے کی تیاری کر لی تھی اور آج جب روانگی تھی تو اس کے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، وہ بیڈ پر بیٹھی روئے جا رہی تھی جب فواز کسی کام سے اندر آیا تھا اور اس کے قریب آ کر بلکے بلکے انداز میں بولا تھا، وہ کچھ نہیں بولی تھی بس روتی رہی تھی۔

”یار اب بس بھی کرو، اگر تم رونے سے باز نہ آئی تو میں نہیں جاؤں گا، میرے ساتھی مجھے جو مرضی کہتے رہیں، میرا مستقبل جتنا چاہے خراب ہو جائے، میرا کیریئر بے شک داؤ پر لگ جائے

اور سب سے اہم بات کہ میری سب سے بڑی خواہش چاہے میرے دل میں ہی مر جائے میں نہیں جاؤں گا، لوگ تو جانے کیسے اتنی بڑی بڑی قربانیاں دے لیتے ہیں تم میرے لئے میری خوشی اور خواہش کے لئے اتنا نہیں کر سکتی تو مجھے بھی کہیں نہیں جانا، اب میں تمہیں ایسے چھوڑ کر تو نہیں چا سکتا، تمہیں میری خوشی کا خیال نہیں ہے مجھے تو تمہارے دکھ کا احساس ہے۔“ فواز جانتا تھا کہ اب بس ایک ہی حربہ ہے امتثال کے دل کو موڑنے کا وہ ہے جذباتی طور پر بلیک میلنگ، لیکن وہ دل میں ڈر رہی رہا تھا کہ اگر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا تو وہ کیا کرے گا کیسے چاہئے گا۔

”مجھے احساس ہے آپ کے کیریئر کا آپ کے فیوچر کا، لیکن میں کیا کروں میرے لئے آپ کے بغیر رہنا بھی تو مشکل ہے۔“ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی

تھی۔
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یار کچھ پانے کے لئے تھوڑی سی قربانی تو دینا پڑتی ہے نا۔“
 ”تھوڑی سی قربانی، یہ تھوڑی سی قربانی ہے۔“
 ”چلو بڑی قربانی۔“

”ٹھیک ہے آپ نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو جائیں لیکن صبح شام مجھے فون کیا کریں گے اور بہت جلد مجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔“
 محبوب شوہر کے دل کی آرزو وہ خوب سمجھتی تھی، اس لئے دل پر ڈھیروں پتھر رکھ کر اس نے نواز کو کہہ کر دیا تھا لیکن یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے یہ سب کیسے کہا تھا۔

”اوہ یار یو آر گرینٹ! تم صبح شام فون کی بات کرتی ہو میں ہر پل تم سے رابطے میں رہوں گا اور بہت جلد تمہیں اپنے پاس بلا لوں گا، تم کیا جھکتی ہو بس دور رہنا تمہارے لئے ہی مشکل ہے اور میرے لئے بڑا آسان ہے، میں تم سے دور رہ کر کیسے گڑیاں گزاردوں گا یہ تو مجھے ہی پتہ ہو گا نا۔“

”اجھلا بس بس، آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں آپ کو کبھی نہیں جانے دوں گی۔“ دل نواز کی باتوں سے موم بن کر ایک بار پھر قطرہ قطرہ پھلنے لگا تھا۔

”اوکے چلو آؤ میرا سامان تو چیک کرو میں نے سب کچھ رکھ لیا ہے، بلکہ تم کسی بیوی ہو شوہر بے چارہ صبح سے پکینگ کر رہا ہے اور تم آرام سے بیڈ پر لیٹی ہو۔“ نواز نے اس کا دھیان بنانے کی غرض سے جلدی جلدی کہا تھا۔

پھر اس کے جاتے ہی یہ دل سنان ہو کر رہ گیا اچھا بھلا اک شہر تھا دیران ہو کر رہ گیا ہر نقش باطل ہو گیا اب کے دیار ہجر میں

اک زخم گزرے وقت کی میزان ہو کر رہ گیا نواز کو گئے ہوئے دو دن ہی ہوئے تھے اور انتقال کو لگ رہا تھا وہ سال دو صدیاں اسے دیکھے بن گزرتی ہیں، نواز کے جانے سے وہ یوں خالی ہو گئی تھی جیسے کئی چنگ زمین اور آسمان کے بیچ ڈوبتی ہے جیسے سب کچھ ہر کام ختم ہو گیا ہو، جیسے وہ اپنے مرکز اپنے مدار سے ہٹ گئی ہو، وہ قریب تھا تو دن اور رات کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا، وہ دور ہوا تو لگا زمانے ٹھہر گئے ہیں شرات نکلتی تھی نہ دن گزرتا تھا، وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بلا مقصد چکراتی رہتی تھی۔

”نواز میں کیا کروں، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں، آپ جلدی سے لوٹ آئیے نا۔“ دو دن بعد ہی وہ فون پر روتے ہوئے بولی تھی۔

”میری جان پلیز خود کو سنبھالو، میری خاطر پلیز، دیکھو میری حالت بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔“ اس کے اپنے لہجے میں بھی جدائی پورے وجود کے ساتھ کمر لائی پھرتی تھی۔

”کب تک سنبھالو خود کو۔“ انتقال نے تھک ہار کر ریسیور کرڈل پر پٹخ دیا تھا، وہ نہیں تھا تو جینے کی آس ختم ہوتی نظر آتی تھی، دل کی ٹکیوں میں جدائی کی دھول یوں اڑنے لگی تھی جیسے کہیں سے سرخ آندھی اٹھتی ہے اور آن واحد میں ہر منظر پر چھا جاتی ہے۔

”کاش نواز مجھے آپ سے اتنی محبت نہ ہوتی، ایسی محبت جس کا انجام اور اختتام عشق کی سرحدوں پر جا ہوتا ہے، وہ محبت اپنے آپ میں کہاں رہنے دیتی ہے کہتے ہیں محبت دل کی تسکین ہے لیکن جدائی میں یہ روح کا آزار بھی بن جایا کرتی ہے، محبت کچھ نہیں ہے مگر ایک لمحہ، ایسا لمحہ جو ایک بار زندگی میں آتا ہے اور پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے، وہ لمحہ زندگی پر ایسی معیاری کرتا ہے کہ زندگی کی اپنی شکل تو کہیں کھو جاتی ہے

بس سامنے نظر آتی ہے تو محبت، محبت کا چہرہ محبت کی صورت، جن سے بہت محبت ہو جن کے بغیر ایک سانس بھی لینا جرم ٹھہرے، جن کے ہونے سے زندگی کا وجود ہو وہی تو دوری اور جدائی کا عذاب دے جاتے ہیں۔

”کیا ہوا آج کل کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے کیا۔“ اک سر می شام ڈھلنے کو تھی جب زنبو یہ اس سے ملنے آئی تھی، نواز کی جدائی کا عکس کہاں کہاں نظر نہیں آ رہا تھا، اس کا ملگھا لباس اچھے پال، اداس چہرہ، منتشر بیڈ روم، گھر کی ابتر حالت، درو دیوار سے پختی وحشت، لان میں لگے پودے عدم توجہ کی وجہ سے مرجھانے کے قریب قریب تھے۔

”کھانا پینا تو بہت دور کی بات ہے یوں کہو سانس لینا بھی چھوڑ رکھا ہے کیا، نواز کے بغیر میں زندگی کہاں جی رہی ہوں، وقت تو اسی دن اس گھر کی دہلیز پر اس کے لوٹ آنے کی آس بن کر ٹھہر گیا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے لباس کی شکنیں درست کی تھیں اور اچھے بکھرے بال سنوارے تھے اور زنبو یہ کے لئے اٹھ بیٹھی تھی۔

”اوہ تو یہ محبت ابھی تک چل رہی ہے۔“ زنبو یہ کا نفرتی قبضہ کمرے میں گونجا تھا اور انتقال کو اس بے موقع ہنسی کی سمجھ نہیں آتی تھی۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”مطلب یہ کہ اب تم اس افیر والے فیر سے باہر نکل آؤ، تمہاری ڈاکٹر صاحب سے شادی ہو چکی ہے اور جب شادی ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے، میرا تو خیال تھا یہ عشق و شوق کا بھوت تمہارے سر سے اتر دکا ہو گا بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ اب میں تم سے ملوں گی تو ایک بدلی ہوئی انتقال نواز مجھے ملے گی، میں پوچھوں گی ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے اور تم کہو گی چھوڑ دیا کوئی اور بات

کر دو، اب کیا ہر وقت بندہ شوہر نامدار کی باتیں کہا کرے اور سنا کرے۔“

”لیکن یار تم تو ذرا نہیں بدلی ہو، بلکہ اس عشق نے تو تمہارا پہلے سے بھی برا حال کر دیا ہے تم تو ڈاکٹر صاحب کی تصویر آنکھوں میں سجا کر یوں بیٹھی ہو جیسے..... جیسے.....؟“ اسے انتقال کے حسب حال کوئی مثال نہ مل رہی تھی۔

”جیسے؟“ انتقال نے اسے سوچنا پکڑا کر اور اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت سے متاثر ہوئے بغیر کہا تھا۔

”جیسے بس چھوڑ دو، کیا کچھ کھلانے پلانے کا ارادہ نہیں ہے، تم نے تو ان کی یاد میں سب چھوڑ رکھا ہے لیکن یار گھر آئے مہمانوں پر تو کچھ رحم کرو، ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔“ زنبو یہ کو کوئی مثال نہ سوچی تو بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

”سوری یار، تم نے مجھے باتوں میں ایسا لگا یا کہ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر اٹھ گئی تھی۔

”ہاں اب آپ کو کسی اور کا خیال کہاں رہے گا۔“ زنبو یہ نے اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو کر دہائی دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”میں اب جا رہی ہوں، جلد ہی دوبارہ چکر لگاؤں گی، تم نے اداس نہیں ہونا، بس یہ سوچ لیا کرو یہ فوجی جدائی ہے۔“

شام ڈھل گئی تھی، جب زنبو یہ نے انتقال سے اجازت چاہی تھی اور اسے ڈھیر ساری سلی دے کر رخصت ہو گئی تھی۔

”وقت جدائی، جدائی تو جدائی ہوتی ہے، وقتی ہو یا ابدی، یہ تو پل پل زندہ کرنی اور پل پل ماری ہے۔“ زنبو یہ کے جانے کے بعد بھی انتقال کی سوچوں میں وہی درکھلا ہوا تھا جو ڈاکٹر نواز جاتے جاتے کھول گیا تھا۔

دن مہینے بن گئے تھے اور مہینے سال پر محیط ہو گئے تھے، نواز کو پرایا دیس ایسا بھایا تھا کہ تو وہ خود ہی لوٹ کر آیا تھا اور نہ ہی اشتال کو اپنے پاس بلا سکا تھا، وہ جلد لوٹ آنے کا وعدہ اور جلد اس کو پاس بلانے کی آس اک پوٹلی میں بندھی ہوئی سوچوں اور لفظوں میں دھری کی دھری رہ گئی تھی، بلکہ پہلے جس تو اتار سے فون اور پیغامات آتے تھے اب تو کچھ عرصہ سے اس سلسل میں بھی کمی سی آگئی تھی۔

”لگتا ہے ڈاکٹر صاحب کسی اور چکر میں پڑ گئے ہیں، لگتا ہے کوئی ہے جو قدموں کی زنجیر بن کر پلٹ گیا ہے۔“

”اب پرایا دیس ہے بھی تو ایسا، قدم قدم پر بہکاوا، قدم قدم پر حال، بندہ بچے بھی تو کتنا، ہاں اگر ایسا نہ ہوتا تو کھر کی یاد تو آتی۔“

بس جانے والے جاتے ہوئے کچھ اور ہوتے ہیں اور واپس لوٹتے ہیں تو کچھ اور کہنے والے بہت کچھ کہہ ڈالتے تھے اور یہ لفظ کس طرح اشتال کے دل میں چھید بڑھاتے جاتے تھے یہ وہی جانتی تھی، پہلے تو اسے یہ کہنے والوں پر غصہ آتا تھا پھر دکھ ہوتا تھا اور اب تو کچھ عرصہ ہوا تھا اس کا اپنا دل بھی ڈانواں ڈول رہے لگا تھا، اب کوئی ایسی بات نہ کر جاتا تو وہ گھنٹوں بیٹھی کڑھتی رہتی تھی، سوچتی رہتی تھی، دل کو عجیب عجیب دوسے اور وہم ستاتے رہتے تھے۔

”زنوبیہ تم تو اول روز سے ہی میرے ساتھ ساتھ نواز کو چاکی ہو، کیا دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی ایسا سوچتی ہو کہ نواز مجھے چھوڑ کر بھلا کر جا سکتا ہے۔“ چونکہ اب شک کا ناگ اس کے اپنے دل میں کنڈلی مار بیٹھا تھا وہ اس کی تصدیق گویا زنوبیہ سے چاہتی تھی۔

”وہ ایسے لگتے تو نہیں ہیں، لیکن یار پھر بھی

مرد ذات کا کیا اعتبار۔“ زنوبیہ نے جہاں نواز کی کچھ خونی بیان کی تھی وہیں اس کے دل کے اندیشے کو کچھ گہرا بھی کر دیا تھا۔

”ہاں مرد ذات کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن مجھے نواز پر تو بھروسہ ہے، وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔“

”ہونہ، ہے تو مرد ہی نا، جن کا دل کب بدل جائے کیا خبر۔“

”اچھا بس کوئی اور بات کرو۔“ اس نے اپنے اندر دکھ کی اک لہری اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی اور گہرا کر زنوبیہ سے کہا تھا۔

”اور بات تو یہ ہے کہ تم اس درد و ہوار سے نکلو، ایک شخص کے لئے ساری دنیا چھوڑ کر اس حجرے میں بیٹھی ہو اس سے باہر آ کر بھی دیکھ کہ تمہارے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، پھر دیکھنا وقت گزارنا اور زندگی جینا تمہارے لئے کتنا سہل ہو جاتا ہے۔“

”ہاں میں اب خود چاہتی ہوں کہ اپنے دل کے لئے کچھ اور کروں۔“ زنوبیہ کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کی بات مان جائے گی وہ تو گھر سے سوچ کر آئی تھی کہ اس کے ساتھ بے حد مغز ماری کرنا پڑے گی اور پھر بھی ہو سکتا ہے وہ نہ مانے، لیکن اس کے صبر کا یہاں اب شاید جھٹکنے کو تھا یا شاید وہ جدالی کا یہ بوجھ اٹھاتے تھک گئی تھی، اس لئے خلاف توقع بولی تھی۔

”ویری گند، سب سے پہلے تو کل میرے ساتھ چلو، آپی کی این جی او ایک معذور بچوں کے اسکول میں کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ارنیج کر رہی ہے ہم بھی کل ان کا ساتھ دیں گے۔“ زنوبیہ نے جھٹ پٹ پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم مجھے ناٹم بتا دو میں آ جاؤں گی۔“

”او کے۔“ اس نے وعدہ کر لیا تھا۔

بھولے بھالے معصوم مگر معذور بچوں کے ساتھ ایک بے حد مصروف پھر ادن گزار کر وہ گھر واپس آئی تو بہت تھک چکی تھی، وہ اپنے غم کو سینے سے لگا کر بیٹھی ہوئی تھی، آج احساس ہوا تھا کہ زمانے میں اس محبت کے غم کے سوا اور بھی غم ہیں اور لوگ ان کے ساتھ کیسے جی رہے ہیں یہ اس نے آج ننھے ننھے بچوں کے بلند حوصلوں اور مسکراہٹوں سے سیکھا تھا۔

”اب تم مجھے یاد کرو گے تو میں جنہیں یاد کروں گی ورنہ نہیں۔“ اس نے رات کو سونے سے پہلے دل میں پکا عزم کیا تھا لیکن یاد کا گھل کسی عہد یا وعدے کا پابند تھوڑی ہوتا ہے بے حد تھکاؤ کے باوجود باہر سے بہت سارا حوصلہ سمیٹ لانے کے باوجود رات سر پر آئی تھی تو تھائی گویا کمرے کی ہریٹے سے پھوٹ پڑی تھی، آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر نیند پھر بھی نہیں آ رہی تھی، وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی لیکن سکون تھا کہ جانے کہاں جا کھویا تھا۔

اسے کہنا کہ سائیں اب بھی تیرے ہی نام سے چلتی ہیں دل اب بھی تیرے ہی نام سے

دھڑکتا ہے آنکھیں اب بھی منتظر ہیں سادوں اب بھی برستا ہے گہرا سے کہنا

اب رات گزرتی نہیں پرندے گیت گاتے نہیں بہار اب آئی ہی نہیں مگر!

انتظار اب بھی تھا

انتظار اب بھی ہے

کہتے ہیں کچھ محبتیں کو سہاروں پر جمی برف

ہوتی ہیں جنہیں کوئی نہیں کھٹھلا سکتا، کچھ گھاس پر جمی کبر ہوتی ہیں جو اندر ہی اندر گلا کر رکھ دیتی ہیں، کچھ چاند کی طرف ہلکتی چکور ہوتی ہیں، لا حاصل صرف اور صرف لا حاصل اور کچھ سردیوں کی دھوپ جیسی نرم نرم حرارت مردہ تنوں میں جان ڈالنے والی ہوتی ہیں۔

نجانے ڈاکٹر نواز! تمہاری محبت کیسی ہے جو زندہ بھی رکھتی ہے اور مرنے بھی نہیں دیتی، رات انہی بے مصرف سوچوں میں کٹ گئی تھی اور اگلے دن وہ پھر کہیں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی، پھر یہ سلسلہ چل پڑا تھا، دن تو جیسے عیسے نام نہاد مصروفیت کی نظر ہو ہی جاتا تھا، مگر رات پہاڑ بن کر سر پر آ کھڑی ہوتی تھی جو کسی طور کٹنے کا نام نہ لیتی تھی، ایسے میں تکہ اس کے آنسوؤں سے بھٹکتا رہتا اور کھڑی کی سوئی کی تک تک وقت گزرنے کا اعلان کرتی رہتی تھی، جسم زخموں سے چور چور ہو اور آنسو ضبط کر لئے جائیں تو ان زخموں کا درد اور بھی تیز ہو جاتا ہے دل غم سے پھٹ رہا ہو اور یہ سوچ کر کہ ہم میں ضبط بہت ہے روکنے سے گریز کر لیا جائے تو دل کا غم جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب دل مٹھی میں بند ہونے لگے مایوسی کے سائے گہرے ہونے لگیں، بے چارگی بڑھنے لگے، بے بسی روگ بن کر سچو کے لگانے لگے اور تھکی کے سلجھاؤ کی کوئی تدبیر نظر نہ آئے تو ضبط کے بندھن توڑ کر کھل کر رو لینا چاہیے، وہ بھی روتی تھی لیکن وہ زخم جس کا چارہ گریاس نہیں تھا اس زخم کا افاق کیا ہوتا وہ تو ناسور بننے لگا تھا۔

ان دنوں ملک کے حالات خاصے مخدوش تھے، حکومت سوات آپریشن کے نام پر اپنے ہی لوگوں سے اپنے ہی لوگوں کو تباہ و برباد کروا رہی تھی، لئے پٹے مہاجرین کے قافلے اپنے اپنے

گھروں سے بے سرو سامانی کے عالم میں ملک کے گوشے گوشے میں جا پھیلے تھے، اچھے خاصے صاحب ثروت لوگ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے پر مجبور ہو گئے تھے، اپنی کی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر آتے وقت وہی زمانہ یاد آتا تھا جب پاکستان بنا تھا جب برصغیر پاک و ہند کو تقسیم کیا گیا تھا، جب ایسی ہی ہجرت ہوئی تھی، متاثرین سوات کو دیکھ کر لگتا تھا کہ دنیا کی دوسری اقوام اپنی حالت سنوارنے میں لگن ہیں اور ہم اپنی حالت کے بگاڑنے کے درپے ہیں، ہم نے آزادی کے بعد 1947ء میں آغاز سفر کیا اور اتنے سال گزر جانے کے اور بھی لگتا ہے وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے، زنوبہ کی آبی کی این جی او آج کل انہیں مہاجرین کے لئے دن رات ایک کینے ہوئے تھی، امتثال کو خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ مل گیا تھا، اس نے فنڈ ریزنگ میں، ان فنڈز کو آگے پہنچانے میں ان لوگوں کے ساتھ ساتھ کام کیا تھا اور یہ حقیقت بات تھی کہ اسے ایسا کر کے دلی سکون اور تسکین ملی تھی۔

”انتہال نواز آپ کا جذبہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔“ این جی او کے سرگرم رکن معیز خان نے اس کی ان تھک کوششوں کو سراہا تھا۔

”یہ کڑا وقت ہم پہنچ بھی آ سکتا ہے، وہ ہمارے لئے کوئی غیر تو نہیں، کیا ہوا آج اگر ہم اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سوتے ہیں، کیا ہوا ہمارے پاس سب کچھ ہے، کل ان کے پاس بھی سکون آرام دولت سب کچھ تھا اور انشا اللہ یہ دوبارہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے، لیکن اگر آج مشکل کے ان لمحات میں ہم ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو کون دے گا۔“ اس نے بلا کسی لگی لپٹی کے کہا تھا۔

”ہاں بات تو آپ کی سوتی صد درست ہے، اگر سب لوگ آپ جیسی سوچوں کے مالک ہو جائیں تو سب کچھ بہت جلدی سنور سکتا ہے۔“ معیز خان نے پھر سادگی انداز اپنایا تھا۔

”سب نہیں تو کیا ہوا ابھی دنیا بہت اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے، اسی لئے ابھی امید بانی ہے اور یہ دنیا بانی ہے۔“ وہ پرس کندھے سے لٹکا کر آفس سے باہر نکل آئی تھی، معیز خان نے اسے بہت دور تک جاتے دیکھا تھا۔

آج اداسی کا رنگ بہت گہرا تھا، وہ گھر آئی اور کھانا کھائے بغیر لپٹ گئی تھی، اس نے سوچا جن لوگوں سے آج مہاجر کمپ میں ملاقات ہوئی ان کی اداسی شاید میرے اندر تک سرایت کر گئی ہے اور یہ میرا موڈ اسی وجہ سے ہے لیکن اندر ہی اندر کوئی اور چیز دل کو دھیرے دھیرے کاٹ رہی تھی اس کا سبب کیا تھا آج اس بارے میں وہ دھیان نہیں دینا چاہتی تھی، جان بوجھ کر انجمن بننے کا بھی اپنا ہی لطف ہے۔

”ٹھک..... ٹھک..... ٹھک۔“ پہلے بیل ہوئی تھی اس نے شاید دھیان نہیں دیا تھا پھر دروازہ ایک تواتر سے بجنے لگا تھا، آنے والے کو شاید بہت جلدی تھی، وہ ابھی آکر لیٹی تھی، گیٹ پر موجود چوکیدار بھری دوپہر میں جانے کہاں جا سویا تھا مجبوراً اسے دھوپ میں تقریباً بھاگتے ہوئے گیٹ تک جانا پڑا تھا۔

”آپ۔“ اسے لگا گیٹ کھلتے ہی جس پر نظر پڑی ہے وہ محض نظر کا دھوکا ہے اور شاید تیز دھوپ کا کمال۔

”ہاں میں، کیا دھوپ میں ہی کھڑا رکھو گی۔“ وہی اپنائیت بھرا لہجہ تھا جو ہمیشہ گھال کر دیتا تھا، وہ اس کے کندھے سے سر نکا کر زار و قطار رو پڑی تھی۔

”یار دھوپ میں اتنی برسات پہلی دفعہ دیکھی

ہے۔“ وہ اسے لئے ہوئے اندر آ گیا تھا ہاں البتہ کھل کر رونے سے اسے نہیں روکا تھا۔

”آپ اب بھی نہ آتے، مر جاتی تو تب آتے، ابھی گیا ضرورت تھی۔“ بہت سارے غلے شکوے ہوں تو نہ زبان ساتھ دیتی ہے اور نہ الفاظ، وہ بے ربط سے لہجے میں بولی تھی۔

”تم تو میری زندگی ہو اور میں اپنی زندگی کو کیسے مرنے دیتا۔“ نواز نے کہا تھا تو امتثال کے رونے میں اور شدت آگئی تھی، اس لہجے کو وہ کتنا ترسی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

”یہ ابھی کہہ رہے ہیں نا، آپ نے تو مجھے بھلا ہی دیا تھا، آپ کو باہری رنگینوں میں، میں یاد بھی کہاں رہی تھی، اب لوٹ آئے ہیں تو جانے کیسے، جانے میری کس دعائیں اتنا اثر تھا کہ آپ واپس آ گئے ہیں، آپ نے تو سب رابطے ہی کم کر دیئے تھے بلکہ ختم، کوئی یوں بھی کرتا ہے۔“

”تم نے سب کچھ پوچھ لیا لیکن مجھے بھی تو کچھ کہنے کا موقع دو، تمہیں پتہ ہے اب جا کر مجھے احساس ہوا ہے کہ ہم اپنے وطن میں وسائل کی کمی اور مسائل کا رونا روتے ہیں اور باہر جا کر پتہ چلتا ہے کہ ہماری پہچان اور ہم سب کچھ اسی وطن کی بدولت تو ہیں، یہاں ہمیں جو عزت ملتی ہے باہر جو کچھ بھی کریں اس کا عشر عشر بھی نہیں ملتی، جب تم سے رابطہ کم ہوا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں بدل گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں بحیثیت پاکستانی اور مسلمان نشیث کے لئے قید کر لیا گیا تھا، باہر سب ہمیں دہشت گرد سمجھتے ہیں اور اب اس طرح کا سلوک کرنا وہ لوگ اپنا حق گردانتے ہیں، تمہیں بتانا تو تم کتنا پریشان ہوئی، اس لئے جب ہماری سب کی کلیرنس ہوئی تو دل وہاں سے اتنا اچاٹ ہوا کہ ہم نے واپس آنے میں ہی عافیت جانی اور اس یقین کے ساتھ لوٹ آئے کہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے اپنے وطن سے بڑھ کر کچھ نہیں، یہاں

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

اردو کی آخری کتاب	165/-
نثار گندم	200/-
دنیا گول ہے	325/-
آوارہ گرد کی ڈائری	200/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	200/-
چلتے ہو تو چین کو چلے	180/-
نگری نگری پھر اسافر	5/-
خط انشائی کے	200/-
ہستی کے اک کو پتے میں	200/-
چاندنگر	165/-
دل وحشی	165/-
آپ سے کیا پردہ	250/-
ڈاکٹر مولوی عبدالحق	200/-
قواعد اردو	200/-
انتخاب کلام میر	60/-
ڈاکٹر سید عبداللہ	160/-
طیف نثر	120/-
طیف غزل	120/-
طیف اقبال	120/-
لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور	
فون نمبر: 7321690-7310797	

سب کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہاں تم ہو، میری زندگی، میرا پیار۔“

”اتنا کچھ ہوا اور آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ کانی دیر پریشان بیٹھے رہنے کے بعد وہ تشویش سے بولی تھی، اب جبکہ شک فواز کی بات سننے ہی ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا تھا اور مجھے صرف یہ تشویش رہ گئی تھی کہ فواز نے یہ وقت مجھے گزارا ہوگا، اب دل اس بات پر ہلکا ہوا کرتے نہیں تھک رہا تھا کہ وہ خیریت سے واپس تو آگئے نا۔

”تم کیا کرنی سوائے پریشان ہونے کے، جو تم پہلے ہی کم نہ تھی، اب تو آگیا ہوں نا اور اب کبھی نہیں جانا۔“ اس کی پریشان صورت دیکھ کر فواز نے بلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا کہ وہ کچھ بہل جائے۔

”اب آپ جا کر تو دکھائیں۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

”نہیں جناب اب کہاں جائیں گے، اب تو دن رات آپ سے ان شب و روز کی داستان سنا کر یں گے جو آپ نے ہمارے جہر میں گزارے، وہ کانی راتیں، وہ طویل دن۔“ فواز شوخ ہوا تھا۔

”ہاں آپ تو مزے لے لے کر سنا کریں گے اور جس نے سولی پر لٹکتے ہوئے یہ عرصہ گزارا اس کا کچھ خیال نہیں۔“

”خیال کیوں نہیں، اسی کا خیال تو ہے ہیں۔“ فواز نے اسے اپنے قریب کیا تھا۔

”لوگ پتہ ہے کیا کہتے تھے۔“ وہ بولی تھی۔

”کیا؟“

”لوگ کہتے ہیں آپ نے وہاں دوسری شادی کر لی ہے، شادی نہیں کی تو کوئی اور ہے ضرور جو آپ کو واپس نہیں آنے دے رہا۔“ سب پریشانی ختم ہو گئی تھی اور اب امتثال فواز کو چھیڑنے پر آمادہ تھی۔

”اور تم لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔“ فواز نے اسے گھورا تھا۔

”ہاں تو کیا کرتی اس تو مجھے بھی یقین ہونے لگا تھا۔“

”اچھا، تمہارا مجھ پر یقین اتنا کم تھا اور جو تم مجھے کہا کرتی تھی کہ مجھے اپنے آپ سے بھی زیادہ

آپ پر یقین ہے، وہ کیا جھوٹ تھا۔“

”نہیں وہ جھوٹ نہیں تھا، بس کبھی کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ نا چاہے ہوئے بھی ایسا ویسا سوچنا پڑتا ہے اور اگر میں کہوں۔“

بہت ہے مان تم پر سنو پاس دفا رکھنا سبھی سے تم ملو لیکن ذرا فاصلہ رکھنا

چھڑنا بھی تو پڑتا ہے ذرا سا حوصلہ رکھنا وہ سارے وصل کے لئے تم آنکھوں میں سجا رکھنا

ابھی امکان باقی ہے ابھی لب پہ دعا رکھنا بہت تپا اب ہیں اور کھو ہمیں سب سے جدا رکھنا

فواز نے کبھی لہجے میں کہا تھا۔

”اب آپ کو نہیں سمجھے آپ سے کہنا ہے، پاس دفا تو آپ کو رکھنا ہے۔“ وہ جلدی سے بولی تھی۔

”بٹینگ ہے، یہ میرے الفاظ ہیں اور میرے دل کی آواز بھی۔“ فواز نے اسے چھیڑا تھا۔

”آپ کے اور میرے دل کی آواز الگ تو نہیں۔“ امتثال نے ایک جذب کے عالم میں کہا

تھا اور فواز کی ساری پریشانیوں اور ساری تھکاوٹیں مل بھر میں ختم ہو گئی تھیں، محبت ایک بار پھر ان دونوں کے درمیان ہنسی کھلکھلائی ہوئی حکمت

سے آن بیٹھی تھی اور وہ اس محبت کے دائیں بائیں بیٹھے خود بھی محبت کی تصویر بن گئے تھے۔